© rasailojaraid.com

وعدہ عرب بہار

سیاسی پیش رفت میں کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا پڑتا ہے!

شیری برمن

خلاصہ:

عرب بہار کو مشرقِ وسطیٰ میں ایک نئے دور کی ابتدا کے طور پر دیکھا جا رہا تھا۔ وہ دور جو جمہوریت اور اس کے ثمرات ساتھ لائے گا۔ لیکن (اس کے آغاز کے) کچھ ہی عرصہ گزرنے کے بعد شکوک و شبہات اور خوف کی فضا بنتی دکھائی دے رہی ہے۔ شکوک اس بارے میں کہ کیا یہ واقعی جمہوریت لا سکے گی یا عرب معاشروں کو محض انتشار میں دھکیل دے گی۔

زیرِ نظر مضمون میں تاریخی حقائق کا جائزہ لے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ جمہوریت راتوں رات آنے والی تبدیلی نہیں اور نہ ہی یہ ایک ہموار عمل ہے۔ درحقیقت ایک مستحکم اور آزاد خیال جمہوریت ایک طویل اور بسا اوقات پرتشدد جدوجہد کے بعد ابھرتی ہے۔ اس ضمن میں فرانس، اٹلی اور جرمنی کی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ یہ مضمون تاریخی حقائق کے تجزیے کے ساتھ ساتھ امید افزا بھی ہے کہ عرب بہار کے مستقبل کے حوالے سے پھیلی قنوطیت غلط ہے اور مشرقِ وسطیٰ میں جمہوریت کا مستقبل روشن دیکھنا چاہیے۔

عرب بہار کے آغاز کو اب دو سال سے زیادہ کا عرصہ بیت چکا ہے، اور اس کی چمک دمک ختم ہو چکی ہے۔ شمالی افریقہ کی نئی نویلی جمہوریتیں آگے بڑھنے کے لیے جدوجہد کرتی دکھائی دے رہی ہیں یا پھر کنٹرول ہی برقرار نہیں رکھ پا رہیں، خلیج فارس اور دیگر مقامات پر حکومتوں کی تادیبی کارروائیوں نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آزاد خیالی کو دبا رکھا ہوا ہے، شام ایک بدترین خانہ جنگی میں دھنستا چلا جا رہا ہے جس نے مشرق وسطیٰ کو آگ و خون کے دہانے تک پہنچا دیا ہے۔ خطے میں آخر کار جمہوریت کی آمد پر بڑے پیمانے پر اظہار مسرت کے بجائے اب ہر شخص اس کے راستے میں کئی رکاوٹوں کا خوف رکھتا ہے، یہ ڈر کہ اب کیا ہوگا، حتیٰ کہ لوگ کھلے عام پرانے آمرانہ دور کی یادوں کو حسین قرار دینے لگے۔ گزشتہ جون میں جب مصری افواج نے پارلیمان کو معطل کرتے ہوئے وقت کی سوئیوں کو واپس پیچھے گھمانے کی کوشش کی تو وال اسٹریٹ جرنل کے چیف فارن پالیسی کالم نگار نے ازراہ تفنن کہا تھا کہ ''امید کریں کہ یہ کام کرے گا'' (جو اس نے نہیں کیا۔) اور نومبر میں مصر کے صدر محمد مرسی کی اقتدار پر گرفت کی کوشش نے ماضی کی اس یاد کو عام موضوع بنا دیا۔

گزشتہ صدی میں پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد اور حالیہ دہائیوں میں نام نہاد تیسری لہر کے دوران جمہوریت کی ہر کوشش کے بعد ایک جوابی لہر آتی ہے جس میں جمہوری طرز حکومت کی نتیجہ خیزی حتیٰ کہ اس کی خواہش تک پر بڑے پیمانے پر سوالات اٹھتے ہیں۔ سیاسی پیشرفت جیسے ہی رکتی ہے ایک روایتی ردعمل سامنے آتا ہے کیونکہ ناقدین نئے دور کی مشکلات کا رونا روتے ہیں اور اپنے آمر پیشرو کے نام نہاد استحکام اور فرضی امن رکھنے والے ماضی کی طرف حسرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ کوئی یہ خوش امیدی رکھ سکتا ہے کہ اب لوگ زیادہ بہتر جانتے ہیں - اور وہ اس بات کو سمجھیں گے کہ سیاسی پیشرفت درحقیقت کیسی نظر آتی ہے، یہ ہمیشہ ایسی ہی نظر آتی ہے، مغرب میں بھی ویسی ہی جیسی کہ مشرق وسطیٰ میں، اور آگے بڑھنے کا واحد راستہ یہی ہے بجائے اس کے کہ پیچھے قدم پلٹائے جائیں۔

ناقدین جو پہلی غلطی کرتے ہیں وہ نئی جمہوریتوں کو ایک کورا کاغذ سمجھ کر ان سے ویسا ہی برتاؤ کرنا ہے، یہ سمجھے بغیر کہ بہت سے محرکات اور واقعات ان کا انتخاب نہیں بلکہ ورثے میں ملے ہیں۔ ہنگامے، تشدد اور بدعنوانی، یا مخصوص آبادی کی ناپختگی یا نامعقولیت جمہوریت کی اصل خرابی کی شہادت سمجھے جاتے ہیں، بجائے اس کے کہ انہیں گزشتہ آمریت کے امراض سمجھا جائے۔ کیونکہ آمرانہ حکومتیں عوامی جواز نہیں رکھتیں، اس لیے وہ ممکنہ حریفوں کو تقسیم کرنے اور پسندیدہ گروہ کی مدد حاصل کرنے کی خاطر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ساز باز کرتی اور آبادیوں کے درمیان تفریق کو وسیع کرتی ہیں۔ اس لیے جب جمہوریت کا عمل شروع ہوتا ہے تو عدم اعتماد اور عداوت کا لاوا پھٹ پڑتا ہے۔ اور کیونکہ آمرانہ حکومتیں اتفاق رائے کے بجائے احکامات پر کام کرتی ہیں اس لیے وہ سیاسی و سماجی اداروں کے قیام سے اختلاف رکھتی ہیں اور اس کی راہ روکتی ہیں، ایسے ادارے جو عام عوامی مطالبات کو پر امن طاقت گفتار دیں اور انہیں منظم کریں۔ اس لیے ایسی نئی جمہوریتوں کے باسی اپنی ناراضگی کا اظہار سخت اور غیر منظم انداز میں کرتے ہیں، تقاریب کو الٹا کر، شدت پسندانہ زور خطابت اور رویے سے اور سڑکوں پر مظاہروں سے حتیٰ کہ جنگوں کے ذریعے سے بھی۔

یہ تمام محرکات عرب بہار کے بعد موجود تھے۔ مثال کے طور پر مصر میں انور السادات اور حسنی مبارک کی حکومتوں نے حقیقی سیاسی جماعتوں کی تشکیل یا آزاد شہری انجمنوں کے قیام کی اجازت دینے سے انکار کیا، جو یہ سمجھنے میں مدد دیتی ہے کہ آخر اسلام پسند ہی کیوں اس وقت سب سے اہم سیاسی قوت ہیں۔ مذہبی تنظیمیں وہ واحد جگہ رہ گئی تھیں جہاں عام شہری اپنے احساسات پیش کر سکتا تھا یا اپنی برادریوں میں آزادانہ متحرک رہ سکتا تھا، اور اس لیے جب حسنی مبارک کی حکومت کا تختہ الٹا اور تبدیلی کے عمل کا آغاز ہوا، تو صرف اسلام پسند ہی اس بنیادی ڈھانچے کے حامل تھے جو موثر انداز میں اپنے حامیوں کو متحرک کر سکتا تھا۔ شہری انجمنوں اور سیاسی جماعتوں کی عدم بالیدگی کی وجہ سے آمریت کے خاتمے کے بعد بہت ہی کم ایسے ادارے بچ جاتے ہیں جو عوامی شکایات کو حل کرنا تو کجا انہیں درست راہ دکھانے کی بھی صلاحیت کے حامل رہ جائیں -- جو مضبوط غیر اسلامی جماعتوں کی موجودہ کمی کو نمایاں کرتا ہے اور مصریوں کی اپنے مطالبات کے حق میں اور بے اطمینانی کے اظہار کے لیے سڑکوں پر آنے کی طرف جھکاؤ کی وضاحت کرتا ہے۔ نومبر میں صدر مرسی کا اپنے حکم نامے کی عدالتی نظر ثانی سے انکار مصری عدالتوں پر اسلام پسندوں کے عدم اعتماد کو ظاہر کرتا ہے، جس کی وجہ حسنی مبارک کے عہد میں قانون کی حکمرانی کے قابل بھروسہ ذریعے کی عدم موجودگی تھی، اسی طرح مبارک مخالف قوتوں کی آج ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرنے میں ناکامی گزشتہ دور حکومت میں ان کی ٹوٹی پھوٹی اور بدگمانی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی تاریخ کی عکاس ہے۔ احمد مکی، وزیر انصاف، نے عدالتی نظر ثانی تنازع پر کہا کہ ''میں پورے مصر کو موردالزام ٹھہراؤں گا، کیونکہ انہیں یہ بھی نہیں پتہ کہ آپس میں بات چیت کیسے کرتے ہیں'' اور یہی حسنی مبارک کا ہدف تھا۔

مشرق وسطیٰ کی دیگر آمریتوں کے بارے میں بھی ایسی ہی داستانیں بتائی جا سکتی ہیں۔ عراق میں صدام حسین نے جان بوجھ کر آبادی کے مختلف حصوں کو ایک دوسرے کے خلاف کھڑا کیا تا کہ وہ مختلف گروہوں میں تقسیم رہیں اور حکومت کی کسی بھی ممکنہ مخالفت کو کمزور کریں! اس عمل کا اور سیاسی و شہری انجمنوں کے مکمل انسداد کا نتیجہ یہ نکلا کہ عراق، حکومت گرنے کے بعد انتہائی پر تشدد ہنگاموں کے دہانے پر آ گیا -- ایک عمل جسے امریکہ نے پرانے نظام کی جگہ موثر نئے نظام کی عدم فراہمی کے ذریعے اور آسان بنا دیا۔ لیبیا میں معمر القذافی نے ایک انوکھی ذاتی آمریت کے ذریعے حکمرانی کی جس نے ملک کو ان کے اخراج کے بعد مکمل طور پر غیر یقینی صورتحال سے دوچار کر دیا، طرابلس میں نئی حکومت کی امن و امان کے قیام میں مشکلات کو بڑھانے کے لیے راستہ ہموار کیا۔ شام میں اسد خان کی آمریت نے ملک کی علوی اقلیت کو دیگر آبادی کے مقابلے میں اہمیت دے رکھی ہے، جس نے بشار الاسد کے اقتدار کو منتشر ہوتے ہی باہمی تناؤ کے لیے میدان فراہم کر دیا ہے۔

آمریت پسندانہ پیشروؤں کے گناہوں کا الزام نئی جمہوری حکومتوں کو دینے کے ساتھ ساتھ ناقدین بہت کامیابی کے ساتھ انتہائی اعلیٰ معیارات بھی مرتب کر لیتے ہیں، ایسے جو سرے سے تاریخی تناظر ہی نہیں رکھتے۔ حالات کے پلٹا کھانے کے بعد تشدد، بدعنوانی، غیر یقینی کیفیت اور نا اہلی کو وہ ایسے اشارے سمجھتے ہیں گویا مخصوص ممالک (یا حتیٰ کہ پورے خطے اور مذاہب) جمہوریت کے لیے تیار نہیں، گویا عام جمہوری تبدیلی ہموار انداز میں براہ راست آزاد خیال نتائج کی رہنمائی کرتی ہے اور جو ملک اس راہ میں لڑکھڑائیں ضرور ان کے اپنے ساتھ کوئی مسئلہ ہے۔ درحقیقت، مستحکم آزاد خیال جمہوریت ایک طویل اور بسا اوقات پرتشدد جدوجہد اور ساتھ ساتھ بہت پیچ و تاب کھانے، غلط شروعات اور چکر کھانے کے بعد ابھرتی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مزید یہ کہ مسائل کوئی خرابی نہیں بلکہ خصوصیت ہیں -- یہ جمہوریت کے ساتھ جڑے مسائل کی علامات نہیں بلکہ سیاسی ترقی کے مشکل وغیر منظم عمل کی شہادت ہیں جس کے ذریعے معاشرے آمریت کی علامات سے خود کو چھٹکارہ دلاتے ہیں اور نئے و بہتر جمہوری نظام کو تعمیر کرتے ہیں۔ مستحکم آزاد خیال جمہوریت کو صرف سیاسی وضع میں تبدیلی کی نہیں بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے؛ اس میں پرانی حکومت کے غیر جمہوری سماجی، ثقافتی اور اقتصادی ورثوں کا خاتمہ بھی شامل ہے۔ ایسا عمل بہت وقت طلب ہوتا ہے اور اس کے لیے بہت زیادہ کوشش درکار ہوتی ہے۔ تاریخی طور پر سب سے ابتدائی تبدیلیاں جمہوری عمل کا آغاز ہیں، اس کا خاتمہ نہیں -- یعنی ایسا کچھ جو آج کی مستحکم آزاد خیال جمہوریتوں کی اذیت ناک تاریخ کو واضح کرے۔

فرانس سے حاصل کردہ سبق

فرانس ہی کو لیجیے۔ جس طرح عرب بہار اور جمہوریت کی تازہ ترین لہروں کا دنیا بھر میں پرتپاک خیر مقدم کیا گیا تھا، بالکل ویسے ہی ۱۷۸۹ء میں فرانس کی موروثی آمریت کے سقوط پر ہوا تھا۔ پری لیوڈ (Prelude) میں ولیم ورڈزورتھ نے اس وقت کو اس طرح یاد کیا کہ جب یورپ ''خوشی سے سرشار تھا،/ فرانس اپنے سنہرے وقت کے عروج پر تھا،/ اور انسانی فطرت ایک نیا جنم لیتی محسوس ہو رہی تھی۔'' ابتدائی امیدوں کے باوجود تبدیلی کا عمل بہت جلد راستے سے ہٹ گیا۔ ۱۷۹۱ء میں فرانس نے آئینی بادشاہت کا اعلان کر دیا، لیکن اس معتدل سیاسی حکومت کو رجعت پسندوں اور بنیاد پرستوں دونوں کی جانب سے مسترد کیا گیا۔ موخر الذکر نے جلد ہی بالادستی اختیار کی، اور ۱۷۹۳ء میں انہوں نے بادشاہ کو قتل کر دیا اور آفاقی تائید کے ساتھ جمہوریت کا اعلان کر دیا اور وسیع شہری و سیاسی حقوق سے وابستگی کا اظہار کیا۔ پھر یورپ کی پہلی جدید جمہوریت جلد ہی اس حالت تک پہنچ گئی جسے دہشت کی حکومت کہا گیا، جس میں ''انقلاب مخالف'' سرگرمیوں کے لیے ۲۰ سے ۴۰ ہزار افراد کو قتل کیا گیا۔

برطانوی سیاسی مفکر ایڈمنڈ برک رجعت پسند ناقدین میں سے واحد معروف شخصیت تھے جنہوں نے استدلال کیا کہ ان تجربات نے بنیادی سیاسی تبدیلیوں کے خطرات کو ظاہر کیا ہے اور اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ضرورت کو بھی کہ اشرافیہ اور ادارے عوامی جذبات کو روکیں۔ لیکن برکے اور دیگر ناقدین غلط تھے۔ تنازع، ہنگامہ اور تشدد جو انقلاب فرانس کے بعد آیا وہ نہ ہی بجائے خود جمہوریت کا بے رحمانہ نتیجہ تھا اور نہ ہی فرانسیسی عوام کی ناپختگی کا ثمرہ؛ اس کے بجائے اس کی جڑیں ماضی میں حکومت کرنے والی آمریت میں پیوست تھیں۔ فرانس میں قدیم نظام حکومت کا انحصار بادشاہ اور معاشرے کے محدود طبقے، یعنی اشرافیہ، کے درمیان اتحاد پر تھا۔ نوابوں کی مدد کو برقرار رکھنے کے لیے فرانسیسی بادشاہ انہیں مختلف مالی فوائد اور رعایات بخشتے، جن میں وظائف، اعانت، خصوصی قانونی برتاؤ، منافع بخش تجارتی مواقع تک رسائی اور محصولات سے استثناء۔ یہ نظام فرانس کے شاہی خاندان کو مملکت کے استحکام اور ایک جدید و مرکزی ریاست کی تعمیر شروع کرنے کی اجازت دیتا تھا۔ لیکن اس نے بڑے پیمانے پر عوام میں یہ تاثر بھی پیدا کیا کہ فرانس کی اشرافیہ وہ طفیلی ہیں جو دہقانوں کا استحصال کر کے ریاست کے وسائل کو چوس رہے ہیں۔

مختصر یہ کہ قدیم نظام حکومت کا انحصار محدود سماجی بنیادوں پر تھا، جس میں بادشاہت اور اشرافیہ ایک غیر صحتمندانہ تعاون میں جڑی ہوئی تھیں اور اس نے معاشرے کے امراء و غرباء کے درمیان ایک عداوت اور تنازع کو جنم دیا۔ جیسا کہ دانشور ہلٹن روٹ نے کہا کہ، اس نے ''معاشرے کو بند اور خود عزت نفسی گروہوں کے درمیان تقسیم کر دیا'' -- اور ان گروہوں کے اراکین، الیکسے دی تکوویل کی جانب سے لوئی شانز دہم کے اپنے وزراء کے پیش کردہ بیان کے مطابق ''آپس میں بہت کم روابط رکھتے تھے کہ ہر کوئی صرف اپنے مفادات کے بارے میں سوچتا تھا، اور کہیں بھی عوام کی خوشحالی کے بارے میں کسی احساس کا شائبہ تک نہ ملتا تھا۔''

اٹھارہویں صدی کے دوسرے نصف تک، چند مہنگی اور تباہ کن جنگوں کے بعد فرانسیسی ریاست سخت مالی بحران سے دوچار ہوگئی۔ منظور نظر امراء پر محصول بڑھانے سے گریزاں حکومت نے زیادہ سے زیادہ قرضے لینے شروع کر دیے اور ۱۷۸۰ء کی دہائی تک یہ حکومت اس کا قرضوں کا بوجھ سہارنے کے قابل نہ رہی۔ بالآخر جب بادشاہ نے مجبوراً ۱۷۸۹ء میں ملک کے مسائل سے نمٹنے کی کوشش کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیے قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کیا، تو مختلف سماجی و اقتصادی گروہوں کے درمیان طویل عرصے سے موجود تنازعات پھٹ پڑے، اور فرانس انقلاب اور بعد از انقلاب شورش کے دہانے پر آن کھڑا ہوا۔

گو کہ فرانس کی پہلی جمہوری حکومت کا تجربہ ناکام ہوا، لیکن اس نے مستحکم آزاد خیال جمہوریت کے حتمی قیام میں بھرپور حصہ ڈالا۔ اقتصادی طور پر انقلاب نے سابق نظام مراتب کی بنیاد پر قائم جاگیردارانہ اعانت کے نظام کی جگہ ایک مارکیٹ نظام پیش کیا جو نجی ملکیت اور قانون کی نظر میں برابری پر منحصر تھا۔ سماجی طور پر اس نے کارگزاری کے لحاظ سے مختلف موروثی گروہوں (اشرافیہ، مزارع اور دیگر) سے تشکیل کردہ معاشرے کو برابری کی بنیاد پر شہریوں کی حامل ایک قوم سے تبدیل کیا۔ سیاسی طور پر اس نے شہریت، حقوق اور قانونی حکمرانی کے عام رویوں کو بدلا۔ اور اس نے ریاست کی جدت کو ڈرامائی انداز میں تیز کیا، مقامی انتظامات اور جاگیرداروں کی لوٹ کھسوٹ کو ایک قومی افسر شاہی اور محصولات کے قومی نظام سے بدلا۔ مختصر یہ کہ انقلاب اور اس کے بعد کے حالات نے قدیم حکومت سے چھٹکارہ پانے کی ڈیڑھ صدی کی جدوجہد میں اہم قدم اٹھائے اور کچھ بہتر اور زیادہ جمہوری اقدامات اٹھائے۔

اٹلی کا کام

دریں اثناء، اٹلی نے پہلی جنگ عظیم سے کچھ پہلے ہی جمہوری روپ دھارا۔ نئی حکومت کو ابتداء ہی سے سماجی تنازعات اور سیاسی عدم استحکام کا سامنا کرنا پڑا، اور ایسے مسائل کا بھی جنہیں جنگ کے بعد کے مشکل حالات نے مزید بڑھاوا دیا۔ ۱۹۲۰ء-۱۹۱۹ء میں تقریباً ۱۳ لاکھ شہری و صنعتی کارکنوں نے کام سے انکار کر دیا اور اعلان کیا کہ مالکان اور مینیجرز کے بجائے اب کارخانوں کے مالکان وہ ہیں۔ دیہی علاقوں میں صورتحال کہیں زیادہ انتشار و بدنظمی کا شکار تھی، کیونکہ مزارع اور زرعی کارکنوں نے غیر مقبوضہ اور کم استعمال شدہ املاک پر قبضہ کر لیا اور اس پر ردعمل دکھاتے ہوئے بڑے زمینداروں نے مزارعوں کے باغیانہ رویے کے خلاف نجی رضاکار بھرتی کر لیے۔ ملک کی دو سب سے بڑی سیاسی جماعتیں جو بالترتیب کیتھولک اور سوشلسٹ نمائندہ تھیں، نے مل جل کر کام نہیں کیا یا وہ اس کی خواہاں نہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھی یا جمہوریت سے غیر مبہم وابستگی نہ رکھتی تھیں، جس نے مستحکم و موثر حکومتوں کے قیام کو ناممکن بنا دیا۔ کئی اطالوی تنازع اور سیاسی عدم استحکام کی مستقل کیفیت سے بیزار ہو گئے اور انہوں نے ملک کے مسائل کا الزام جمہوریت پر ڈالا۔ اکتوبر ۱۹۲۲ء میں جمہوریت مخالفین کو وہ مل گیا جو وہ چاہتے تھے کہ اطالوی بادشاہ نے قدامت پسندوں کے زور پر جمہوری تجربے کو معطل کر دیا اور ملک کو بنیاد پرست دائیں بازو کے متحرک رہنما بینیٹو مسولینی کے حوالے کر دیا۔

فسطائیت کی جانب اس منتقلی کو اٹلی میں اور باہر خوب سراہا گیا، وہ سمجھتے تھے کہ آمریت ملک کو ترقی واستحکام بخشنے کے زیادہ بہتر مواقع دے رہی ہے جس کی ملک کو سخت ضرورت تھی۔ اور مسند اقتدار پر مسولینی کے پہلے سال نے محض ان کی ناموری اور تحسین ہی میں اضافہ کیا۔ لیکن یہ چمچہ گیری نامناسب ہاتھوں میں تھی۔ کم عمر جمہوری حکومت اپنے فسطائی جانشیں کے مقابلے میں زیادہ متاثر کن تھی؛ مزید برآں، اس کے مسائل اس کے اپنے غیر جمہوری پیشرو ہی کا سبب تھے، جس نے جان بوجھ کر اطالوی عوام کو تقسیم کیا، ان پر قابو پایا اور عام مطالبات اور ناراضگی کے اظہار سے انکار کیا۔

صرف چند دہائی قبل جزیرہ نما اطالیہ مختلف سیاسی، اقتصادی، سماجی و ثقافتی تاریخی رکھنے والی کئی علیحدہ ریاستوں کا گھر تھا۔ نقل وحمل کے ناقص جال اور مشترکہ زبان کی کمی کے باعث خطے کے بیشتر باسی دوسروں کے بارے میں کم ہی معلومات اور پروا رکھتے تھے۔ لیکن ۱۸۶۰ء کی دہائی میں ہونے والا اتحاد عوام کے اٹھنے کی وجہ سے نہیں ہوا تھا بلکہ اس میں اوپر سے نافذ کیے گئے فیصلے کارفرما تھے، جو جزیرہ نما کی سب سے طاقتور ریاست پیڈمونٹ کے رہنماؤں نے کیے تھے۔ پیڈمونٹیوں نے باقی علاقے پر درحقیقت (اپنا) وہ سیاسی نظام لاگو کیا جو غیر ملکی تھا، اور نتیجتاً، نئی اطالوی ریاست کو فوری طور پر مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا -- ان برادریوں کی جانب سے جنھوں نے محسوس کیا کہ انہیں نوآبادیات بنا لیا گیا ہے اور پیڈمونٹ اور کیتھولک گرجا ان کا استحصال کر رہا ہے، گرجے نے اطالویوں کی زندگی پر حکومت کرنے والی ایک بالاتر لادین اتھارٹی کا خیال مسترد کر دیا تھا۔

صلاحیت اور شاید عوام کی مدد حاصل کرنے کی خواہش سے عاری اطالوی سیاسی اشرافیہ نے نئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ملک پر ایک ایسے نظام کے ساتھ حکومت کی جو ٹرا سفور میسمو کہلایا، جس میں مختلف پسندیدہ گروہوں کو اقرباء پروری کے ذریعے سیاسی نظام میں منتخب کرنا شامل تھا۔ اس طریقے کے استاد ۱۸۹۲ء اور ۱۹۲۱ء کے درمیان مختلف مواقع پر اٹلی کے وزیراعظم رہنے والے گیووانی گیولیٹی تھے، جنھوں نے کلیدی حلقہ جات کو نوازنے یا سزا دینے کے لیے ریاستی سرپرستی اور درونِ خانہ معاہدوں کی توسیع اور منظوری نہ دینے کو استعمال کیا۔ بالفاظ دیگر، ادارہ جاتی بدعنوانی نوجوان اطالوی ریاست کی پیدائش کے ساتھ ہی اس کی گھٹی میں تھی، جس نے بعد ازاں ملک کی سیاسی ترقی کے لیے گہرے نتائج مرتب کیے۔

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں اطالوی سیاست کے باضابطہ ادارے -- انتخابات اور پارلیمان -- ملک میں قوت کے حقیقی مختار نہیں تھے، اطالوی معاشرے میں کئی گروہوں نے ان میں دلچسپی کھو دی تھی اور ان سے باہر یا حتیٰ کہ ان کے خلاف بھی منظم ہونا شروع کر دیا تھا۔ مزید برآں متعدد گروہوں کی جبراً اختیارات سے بے دخلی نے عداوت اور مایوسی پیدا کی۔ اور کیونکہ سیاسی نظام عوامی خدشات اور مطالبات کے لیے ذمہ دار نہ تھا، اس لیے اطالوی معاشرے کے اندر تقسیم سے مستقل اور موثر کسی بھی انداز سے نہیں نمٹا گیا۔

ان سب کا مطلب تھا کہ جب مکمل تبدیلی کے بعد جمہوریت بالآخر آئی تو نئی حکومت نے اپنی زندگی کا آغاز گوناگوں مسائل کے ساتھ کیا۔ بالفاظ دیگر، ہنگامہ، تنازع اور تشدد جس نے مسولینی کے برسرِاقتدار آنے سے قبل کے سالوں میں اٹلی میں جڑیں پکڑ لی تھیں، بہت زیادہ جمہوریت کی وجہ سے نہیں آیا تھا (جیسا کہ ناقدین دعویٰ کرتے ہیں) بلکہ اس کے کم ہونے کی وجہ سے تھا۔ ملک کا فسطائی دور پیچھے کی جانب سفر تھا نہ کہ آگے کی جانب قدم، اور جب اطالوی جمہوریت دوسری جنگ عظیم کے بعد بحال ہوئی تو وہ اپنے تجرباتی آغاز سے فائدہ اٹھانے کے قابل تھی اور جمہوری تجربے کو وہیں سے شروع کرنے کے بھی جہاں سے اسے چھوڑا گیا تھا۔

مثالی جرمنی

جرمنی پہلی جنگ عظیم کے بعد یورپ بھر میں جمہوریت کی آنے والی لہر کے دوران جمہوریت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بنا، اور نو آموز ویمار جمہوریہ کو بھی اپنی پیدائش ہی سے سماجی تنازع، سیاسی عدم استحکام اور شدت پسندوں کا بوجھ سہنا پڑا تھا۔ جمہوریت کے قیام کے چند ہی ماہ میں مقامی اشتراکیوں نے باویریا میں سوویت جمہوریہ کا اعلان کر دیا، جسے جلد ہی حکومتی کنٹرول سے باہر دائیں بازو کی ملیشیا فریکورپس نے ختم کر دیا۔ اس کے بعد فریکورپس نے اپنے حملے جاری رکھے اور قتل اور پرتشدد مظاہروں میں شامل رہی اور بالآخر ۱۹۲۰ء میں ایک بغاوت کی کوشش کی بھی حمایت کی؛ اس کے بعد دائیں بازو کی دیگر بغاوتیں ہوئیں، جن میں ۱۹۲۳ء میں بیئر ہال پوش میں ہٹلر کی بغاوت بھی شامل تھی، اور ساتھ ہی بائیں بازو کی بغاوتیں بھی۔ اور ان سب سے بڑھ کر ۱۹۲۳ء میں قرضہ جاتی اصلاحات میں ناکامی نے بیلجیئم اور فرانس کو روہر پر قبضہ کرنے کا موقع دیا، جس نے عظیم افراط زر کا آغاز کیا -- جو جرمنی کے درمیانے طبقے کی تباہی اور حکومت اور مرکزی دھارے کے دیگر سیاسی اداروں کی قانونی حیثیت کے خاتمے کا سبب بنی۔

۱۹۲۰ء کی دہائی کے آخر میں کچھ استحکام ضرور آیا لیکن جمہوریت کو سانس لینے کا بھی وقت نہ ملا کہ عظیم کساد بازاری نے زبردست دھچکا پہنچایا۔ جب مرکزی دھارے کی سیاسی قوتیں ڈوبتی ہوئی معیشت اور سیاسی سانحے کے سامنے کانپ رہی تھیں، شدت پسندوں نے میدان پر پنجے گاڑ دیے اور ۱۹۳۲ء کے موسم خزاں میں نازی ملک کی سب سے بڑی جماعت بن گئے، وہ جمہوریت پر حملے کرنے کے ساتھ ساتھ سرمایہ دارانہ نظام کے مسائل سے نمٹنے اور ملک کی سماجی تقسیم کا ازالہ کرنے کا عہد کرنے لگے۔ جنوری ۱۹۳۳ء میں ہٹلر کو چانسلر کا عہدہ پیش کیا گیا اور جرمنی کا جمہوری تجربہ اپنے اختتام کو پہنچا۔

برک اور دیگر کے خوف اور تجزیوں کو بڑھاتے ہوئے رجعت پسند ناقدین کے ہجوم نے دعویٰ کیا کہ ویمار اور دو جنگوں کے درمیان ہونے والے دیگر ناکام جمہوری تجربوں نے ظاہر کیا کہ جمہوریت اور بڑے پیمانے پر عوامی شمولیت ایسے سانحات تھے جن کے رونما ہونے کا انتظار کیا گیا۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ صرف آمرانہ سیاسی نظام جس میں ایک مضبوط حکمران اقتدار سنبھالے، نظام اور نظم وضبط کو یقینی بنا سکتا ہے اور سماجی تقسیم، سیاسی عدم استحکام اور اخلاقی آزادخیالی کا قلع قمع کر سکتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

البتہ ایک مرتبہ پھر ناقدین غلط تھے۔ ویمار کی قسمت کا جمہوریت کے باطنی مسائل یا ہسپانوی لکھاری ہوزے اورتیگا گاسیٹ کے الفاظ کے مطابق ''عام آدمی'' سے بہت کم تعلق تھا بلکہ اس کی جڑیں سابق جرمن آمروں کے افسوسناک ورثے سے ملی ہوئی تھیں۔

جدید جرمنی انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں اپنی طاقتور ترین ریاست، قدامت پسند اور عسکریت پسند پرشیا کی زیر سرپرستی ابھرا۔ حکومت ایک چانسلر کی جانب سے چلائی جاتی تھی جو بجائے عوام کے موروثی حکمران، قیصر، کو جوابدہ تھا، اور اس میں دو قانون ساز ادارے تھے،، ایک پرشیا کے قدامت پسندوں کے زیر تسلط ایوان بالا اور دوسرا عام انتخاب کے ذریعے منتخب ہونے والا ایوان زیریں۔ چانسلر کو اقتدار میں رہنے کے لیے عوامی حمایت کی ضرورت نہیں ہوتی تھی، لیکن اسے اہم قانون سازی سے گزرنا پڑتا تھا۔ اس نرم آمریت یا مخلوط حکومت نے حکمرانوں کے لیے زبردست فوائد پیش کیے کہ وہ سیاسی حریفوں کو عدم توازن کا شکار کرنے اور دفاع پر مجبور کرنے کے لیے اپنے مفادات کو مقدم رکھتے ہوئے سیاست میں جوڑ توڑ کریں۔ اوٹو وان بسمارک، جنھوں نے تقریباً دو دہائیوں تک چانسلر کی خدمات انجام دیں، اس توازن کے استاد تھے، بڑے زمیندار امیرزادوں پر مشتمل اشرافیہ اور بڑے صنعت کاروں کے ایک قدامت پسند غیر جمہوری اتحاد کو برقرار رکھنا اور ساتھ ساتھ اپنے کیتھولک اور سوشلسٹ حریفوں کو تقسیم کرنا، دبانا اور ان کا ہوا کھڑا کرنے نے ملک میں تقسیم کو مزید گہرا کر دیا۔ بسمارک کی ''ریاست کے دشمن'' کی پالیسی نے جرمن قوم پرستی پر مضر اثرات بھی مرتب کیے، جس نے اس خیال کو تقویت دی کہ جرمنی کو بیرونی کے ساتھ ساتھ داخلی خطرات بھی درپیش ہیں۔

نتیجہ ایک سیاسی طور پر متحد لیکن انتہائی تقسیم شدہ جرمنی تھا جو سماجی طور پر قوم پرستی کی ادھوری حس کے ساتھ داخلی و خارجی دشمنوں اور مایوسی و شدت پسندی کے دماغی خلل کا حامل تھا (کیونکہ غیر جمہوری حکومت عوامی ضروریات اور طلب پر ردعمل دکھانے کے قابل نہ تھی یا خواہشمند ہی نہ تھی)۔ ۱۹۱۸ء میں جرمنی کی شکست کے بعد جب جمہوریت کی جانب مکمل منتقلی کے بعد نئی حکومت اپنے پیشروؤں کے اپاہج ورثے کی حقدار قرار پائی، جس میں جنگ ہارنے کے عمداً لگائے گئے غلط الزام اور اس کے ساتھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آنے والے سیاسی، اقتصادی اور نفسیاتی نتائج بھی شامل تھے۔

جرمنی میں، فرانس اور اٹلی کی طرح، گو کہ ملک کا ابتدائی جمہوری تجربہ بری طرح ناکام ہوا، لیکن اس کے مستقبل پر بہت مثبت اثرات مرتب ہوئے۔ جب ایک نسل گزر جانے کے بعد جمہوریت کو دوسرا موقع ملا تو تعمیر کرنے کے لیے بہت کچھ تھا اور سیاسی جماعتوں سے قومی حکومتوں اور مقامی حکومتوں سے لے کر سول سوسائٹی کی انجمنوں تک سب نے راکھ کے ڈھیر سے دوبارہ جنم لیا۔ ویمار تجربے نے سیاسی اشرافیہ کو بعد ازاں مدد دی کہ وہ ماضی کی غلطیاں نہ دہرائیں، اس نے دستور کی تیاری، فلاحی ریاست اور آجر-اجیر تعلقات کی تعمیر، اور بحیثیت مجموعی سیاسی رویے پر اثر ڈالا۔ دو جنگوں کے درمیان کا عرصہ اور اس کا نتیجہ گھن چکر ثابت نہ ہوا بلکہ مستحکم آزاد خیال جمہوریتوں کے قیام میں یورپ کی طویل المیعاد جدوجہد کا ایک اہم مرحلہ ثابت ہوا۔

مزید بہتری

یہ معاملات عرب بہار کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ کہ مصر اور تبدیلی کے عمل سے گزرنے والے دیگر ممالک میں ظاہر ہونے والے آج کے مسائل بالکل عام اور قابل پیش گوئی ہیں، یہ بنیادی طور پر پرانی آمرانہ حکومتوں کے مسائل ہیں بجائے اس کے کہ ان کا الزام نئے جمہوری کرداروں پر دھرا جائے، اور آمریت کے خاتمے اور جمہوری اقتدار کے تجربے کو ملکوں کی سیاسی ترقی کے تناظر میں دیکھا جانا چاہیے، چاہے معاملات بدترین صورت کیوں نہ اختیار کر جائیں، بالآخر وہ بہتر ہو جائیں گے۔

بیشتر ممالک جو آج مستحکم آزاد خیال جمہوریت رکھتے ہیں یہاں تک پہنچنے میں بہت کڑے وقت سے گزرے ہیں۔ حتیٰ کہ ان ممالک میں بھی جنہیں ابتدائی یا آسان جمہوریت سازی کی مثال سمجھا جاتا ہے، جیسا کہ انگلستان اور امریکہ، انہوں نے بھی کہیں زیادہ مسائل کو جھیلا ہے، جس میں مکمل خانہ جنگی بھی شامل ہے۔ ان سنگین حالات کا مطلب یہ نہیں تھا کہ جمہوریت شمالی امریکہ یا مغربی یورپ کے لیے غلط یا ناممکن تھی، اس لیے آج کی نوآموز عرب جمہوریتوں کے مسائل پر یہ نہ سمجھا جائے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ یہ غلط ہیں یا مشرق وسطیٰ کے لیے ناممکن ہیں۔

تب اور اب، نئی جمہوریتوں کو درپیش بیشتر مسائل ورثے میں ملے۔ضروری نہیں کہ جمہوریت فرقہ وارانہ یا سماجی تنازع بے چینی میں اضافے کا سبب بنے،لیکن یہ آمرانہ حکومتوں کے تحت پروان چڑھنے والے عدم اعتماد اور تلخیوں کو سامنے لانے کی اجازت ضرور دیتی ہے، جس کے نتائج بسا اوقات افسوسناک ہوتے ہیں۔لیکن آمرانہ اقتدار کے استحکام کی یادیں ایسے مسائل کا بہت ہی غلط جواب ہیں، کیونکہ یہ آمریت میں پنہاں امراض ہیں جو پہلے مرحلے میں دبے ہوئے مسائل کا سبب بننے میں مدد دیتے ہیں۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ معاشرے اس وقت تک مسائل پر قابو نہیں پا سکتے جب تک کہ وہ مناسب انداز میں ان کا سامنا نہ کریں۔طویل المیعاد آمرانہ حکومتوں کا خاتمہ جمہوریت کے عمل کا اختتام نہیں بلکہ اس کا محض آغاز ہے۔حتیٰ کہ ناکام جمہوری تجربے بھی ملکوں کی سیاسی ترقی میں اہم مثبت مراحل ہیں، ایسے ادوار جن میں اس نے ماضی کے غیر جمہوری سماجی، ثقافتی و اقتصادی ورثوں کا خاتمہ شروع کیا۔آج کے مبصرین کی بڑی تعداد مسائل اور رکاوٹوں کو اشارے سمجھتے ہیں جو بالآخر ایک مستحکم جمہوری نتیجے تک پہنچنے کو یقینی نہیں بناتے۔لیکن انقلاب فرانس، دو جنگوں کے درمیان اطالوی اور جرمنی جمہوریتوں کا سقوط، امریکی خانہ جنگی جیسے پرتشدد اور افسوسناک واقعات اس امر کی شہادت نہیں کہ یہ ممالک آزاد خیال جمہوریت تخلیق یا برقرار نہیں رکھ سکتے؛ یہ جمہوری عمل کا اہم حصہ ہیں جس کے ذریعے ممالک ایسا نتیجہ حاصل کرتے ہیں۔

عرب بہار کی قسمت کے حوالے سے بڑے پیمانے پر پھیلی قنوطیت یقیناً غلط ہے۔ بلاشبہ مشرقِ وسطیٰ ثقافتی، تاریخی و اقتصادی خصوصیات کا انوکھا ملاپ رکھتا ہے۔لیکن دیگر خطے بھی رکھتے ہیں، اور سیاسی پیشرفت کے قواعد کے بارے میں عرب دنیا کو مستقل استثناء دینے کی بہت کم معقول وجوہات ہیں۔ سال ۲۰۱۱ء خطے کے لیے امید افزاء نئے عہد کا آغاز تھا، اور اسے مستقبل میں ایک تاریخی موقع سمجھا جائے گا، گو کہ اس سے نکلنے والے دھارے پر آشوب ہوں گے۔ جمہوریت کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قدامت پسند ناقدین اس مرتبہ غلط ہوں گے، جیسا کہ وہ فرانس، اٹلی، جرمنی اور ہر اس ملک کے بارے میں تھے جب جابرانہ حکومت تلے انہیں بہتر سمجھا جا رہا تھا۔

[شیری برمن برنارڈ کالج، کولمبیا یونیورسٹی میں پولیٹکل سائنس کی پروفیسر ہیں۔]

(ترجمہ: فہد کبیر)

Source: Sheri Berman, "The Promise of the Arab Spring", *Foreign Affairs*, January/ February 2013, PP 64-74.

© rasailojaraid.com